ہماری معاشرتی اقدار مٹ جاتی ہیں ان کو کچھ سمجھ نہیں آتی اور جو من میں آئے وہ کر جاتے ہیں۔ وہ اتنے آزاد ہوتے ہیں کہ جس معاشرے میں وہ رہتے ہیں اس کا وہ بالکل خیال نہیں رکھتے۔

۳۔ تیسری قسم کے نوجوان حسب ضرورت یہ تمام چیزیں استعمال کرتے ہیں۔ لیکن وہ اپنی معاشرتی واخلاقی اقدار کا خیال رکھتے ہوئے ان سہولیات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کو یہ شعور ہوتا ہے کہ کون سی چیزوں کو لینا ہے اور کون سی نہیں۔ وہ باقاعدہ معاشرتی قوائد وضوابط کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ اس مچھلی کی طرح اپنا منہ کھول کر نہیں رکھتے کہ جو کچھ بھی پانی کے ساتھ آئے منہ میں چلا جائے۔ وہ اپنے آپ کو معاشرے میں زمانے کے ساتھ چلنے کے قابل بناتے ہیں۔ ان کی سوچ ہمیشہ مثبت ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کی سوچ اور ذہنی لیول کو سامنے رکھ کر بات کرتے ہیں۔ یہ معاشرے میں Change agent کے طور پر کام کرتے ہیں۔ لیکن جدید دور کی تبدیلی کو بھی اس طرح معاشرے کے اندر لاتے ہیں کہ نہ تو اس سے لوگوں میں برا اثر ہو، اور نہ ہی معاشرے کے وضع کردہ اقدار کو نقصان پہنچے۔

اب نوجوانوں پر یہ بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اچھی طرح جان لیں کہ انہیں کب اور کہاں کون سا کام کرنا ہے۔ مثال کے طور پر وہ لباس جو دوبئی میں پہنا جاتا ہے کیا وہی لباس پاکستان میں کوئی پہن سکتا/سکتی ہے؟ پاکستان کا کوئی بھی بڑا شہر لیں کراچی، لاہور، اور اسلام آباد، یہاں لوگ کیا کھاتے ہیں، کیا پیتے ہیں اور کیا پہنتے ہیں، ضروری نہیں کہ پاکستان کے دور دراز علاقوں میں بھی وہی ماحول ہو۔ وہ گفتگو جو دوستوں کے ساتھ کی جاتی ہے کیا وہی گفتگو ماں باپ کے ساتھ کی جا سکتی ہے؟ یہ وہ معاملات ہیں جو نوجوانوں کے ساتھ براہ راست تعلق رکھتے ہیں۔

تصحیح نامہ

معذرت کے ساتھ مولانا احمد حسن بلغاریؒ کے سوانح سے متعلق درج ذیل تصحیح نامہ پیش خدمت ہے:

محل تصحیح	غلط عبارت	درست عبارت
شمارہ 39 صفحہ 53	خاندانِ ملاپتوا	خاندان بواحاجی پونگ قوم ملایروا
شمارہ 39 صفحہ 56	دارالعلوم اوڈانوالہ	مدرسہ تعلیم الاسلام الفردوس ماموں کانجن

مولانا ابوالکلام آزادؒ
انتخاب: عبدالرحیم روزی

ابوالکلامؒ کی قید تقلید سے آزادی کا سفر

کتاب "معیار الحق" کے جواب اور اس سے متعلق رجال کا ذکر ہو رہا ہے، اس لیے مناسب ہوتا ہے کہ "معیار" کی اثر آفرینی کا ذکر بھی ہو جائے۔ یہ وہ کتاب ہے جس نے متحدہ ہندوستان میں جامد تقلید کی بنیادوں کو متزلزل کیا۔ بڑے بڑے علماء نے اس کا جواب لکھنے کی کوشش کی اور منہ کی کھائی۔ جناب ارشاد حسینؒ کی انتصار الحق کے علاوہ جناب محمد قاسم نانوتویؒ اور جناب محمود حسن دیوبندیؒ نے بھی قلم اٹھایا۔ پہلے "ادلہ کاملہ" یعنی اظہار الحق لکھی گئی۔ پھر چند سال بعد اسی ادلہ کاملہ کی وضاحت میں إيضاح الأدلة لکھی گئی، جس میں قرآن پاک میں تحریف کرنے کی جسارت بھی کی گئی۔ ادھر معیار الحق بڑے بڑے محققین کو راہ راست کی طرف رہنمائی کرتی رہی۔ جس کی مثال جناب ابوالکلام آزادؒ کے علمی سوانح کے مطالعہ سے ہوتی ہے۔ وہ حنفی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے، ان کے والد بڑے متشدد حنفی مقلد تھے۔ جب کہ وہ خود ابتدائے عمر ہی سے تلاش حقیقت کرتے رہے۔ وہ ترک تقلید کے سفر کی داستان خود بیان کرتے ہیں:

"میری پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہوئی، جو مذہبی ریاست و پیشوائی رکھتا تھا۔ علم اور طریقت نسلاً بعد نسل اس کی وراثت چلی آتی تھی۔

ایک چیز چپکے چپکے میرے اندر کام کر رہی تھی۔ یعنی وہابیت اور وہابیوں سے عدم نفرت اور پھر ہمدردی و میلان، میں نے عدم نفرت اور ہمدردی کہا، اس لیے کہ ابتداء میں میرے احساسات یہی تھے۔ عدم نفرت اس لیے کہ میرے لیے یہ سوال نہ تھا کہ وہابیت پسند کی جائے؟ سوال یہ تھا کہ نفرت کی جائے یا نہ کی جائے۔ اس لیے کہ وہابیت کے بارے میں میری خاندانی دنیا میں اصل اباحت نہ تھی بلکہ حذر، یعنی نفرت و تکفیر۔ اور انسان جس قدر بھی مذہبی اور غیر مذہبی برائیوں کا تصور کر سکتا ہے، ان سب کا پیکر و مجسمہ "وہابیت" تھی۔ بس میری ابتدائی اور بسیط حالت اس بارے میں نفرت و بغض کی تھی نہ کہ محبت و عدم محبت کی۔ میں خالی الذہن نہ تھا کہ میلان و عدم میلان کی صورت پیش آتی۔

میرے تو ذہن کے معمور ہونے کا بہتر سے بہتر سامان موجود تھا، اور وہ انتہا درجے کی نفرت تھی۔ اس لیے اس بارے میں، میں جو کچھ بھی سوچ سکتا تھا، وہ اس درجے کے بعد کا تھا، نہ کہ اس سے پیشتر کا۔

حقیقتاً میں سوچتا ہوں تو اس بارے میں والد مرحوم کا تعصب حد درجے تک پہنچا ہوا تھا۔ اور میں حیران ہوں کہ

اسے کیوں کر کسی لفظ و جملے میں محدود کروں، یہ پہلے بتفصیل کہہ چکا ہوں کہ کس طرح اوائل عمر سے یہ عصبیت ان میں جاگزیں ہوئی اور کس طرح مدت العمر ان کی تمام تصنیف و تالیف، وعظ و مباحث کا تنہا مرکز و مطمح رہی۔ مجھے اپنے بچپن کی پرانی سے پرانی مسموعات جو یاد آتی ہیں، ان میں وہابیت کا ذکر موجود پاتا ہوں۔ شب و روز اس کا چرچا گھر میں بھی رہتا تھا اور باہر بھی۔ والد مرحوم کے جو خدام اور مرید تھے، وہ بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور یہ قدرتی تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بچپن میں میرا تخیل یہ تھا کہ وہابی کوئی خاص طرح کا ایک بڑا ہی مکروہ اور قابل نفرت مخلوق ہے۔ میں اپنے ذہن میں اس کا تصور یوں کرتا تھا کہ ایک قبیح صورت کا انسان جس کا آدھا چہرہ کالا ہے اور پیشانی پر بہت بڑا گھٹا ہے۔ یہ اس لیے کہ حافظ صاحب کی زبانی سنتے تھے کہ دل کے کفر اور بغض رسول کی وجہ سے وہابیوں کا آدھا منہ کالا ہو جاتا ہے، اور ان کی ایک علامت یہ ہے کہ لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے پیشانی پر ایک بہت بڑا گھٹا بنا لیتے ہیں۔

ہمارے دیوان خانے میں اس بارے میں خاص مصطلحات اور اسماء تھے۔ اور دنیا کی ہر مکروہ اور خبیث چیز اسی لقب سے پکاری جاتی تھی۔ مثلاً حافظ جی کہتے تھے کہ شب کو اس قدر وہابی تھے۔ کہ نیند نہ آئی۔ (یعنی مچھر بہت تھے) دیوان خانے میں کتابوں کے صندوق پڑے تھے۔ ان کے نیچے وہابی چلے جاتے تھے اور پیندے میں سوراخ کر دیتے تھے۔ چنانچہ بڑی جد و جہد کے ساتھ وہابیوں کو پکڑا جاتا تھا اور ہم لوگ یوں حساب کرتے تھے آج دو وہابی مارے گئے...... ایک بہت بڑا وہابی بھاگ گیا۔ (یعنی چوہا)

نہیں معلوم کون غریب تھا، لیکن بڑا ہی بدصورت آدمی تھا۔ ایک آنکھ سے کانا، دوسری میں بھی جالا۔ چہرے پر شائد فالج بھی گرا تھا۔ ایک طرف سے لب ٹیڑھے تھے، رنگ سیاہ۔ راستے میں کبھی کبھی ہم حافظ صاحب کے ساتھ سڑک پر جاتے، تو اس غریب کی طرف اشارہ کر کے کہتے: دیکھو وہ خبیث وہابی کھڑا ہے۔ مجھ پر اس کی خوفناک صورت کا واقعی بڑا ہی دہشت انگیز اثر پڑتا۔ مجھے یاد ہے، کئی مرتبہ میں نے نیند میں ایسے ہی خوفناک وہابی کو دیکھا اور ڈر کے رونے لگا۔

ایک دن جمعہ کے دن وعظ سے آ کے والد مرحوم حسب معمول دیوان خانے میں بیٹھے تھے۔ قاعدہ تھا کہ وعظ کے بعد آدھ گھنٹہ وہاں بیٹھ کے پھر زنان خانے میں آتے تھے۔ زور زور سے باتوں کی آواز آنے لگی۔ میں دوڑا ہوا گیا۔ ایک شخص پگڑی باندھے، بڑی ڈاڑھی، دوزانو بیٹھا بڑے ادب سے باتیں کر رہا تھا، لیکن والد مرحوم اس پر گرج رہے تھے،

اور تمام لوگ اس طرح خونریز نظروں سے اسے گھور رہے تھے کہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کا خون پی جانا چاہتے تھے۔ اس نے بھی خطرہ محسوس کرلیا تھا، اسی لیے ڈرتا اور کانپتا بھی جاتا تھا، دروازے کے قریب فضل کریم ایک پنجابی مرید بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کون ہے؟ انہوں نے کہا: وہابی ہے۔ اب میں بڑے تعجب سے دیکھنے لگا۔ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ آدھا منہ کالا نہیں ہے، لب بھی ٹیڑھے نہیں ہیں، آنکھیں بھی دونوں ہیں، چہرہ بھی بھیانک نہیں ہے۔ معاملہ میری نظر میں اتنا اہم اور سنجیدہ تھا کہ جونہی والد صاحب کمرے میں آبیٹھے، میں نے کہا: ''**یہ وہابی تھا؟**'' انہوں نے کہا: ہاں۔ میں نے کہا: مگر اس کا چہرہ کالا نہیں تھا۔ انہوں نے کہا: یہ کالک ایک ہی مرتبہ نہیں آجاتی۔ جب کبھی آدمی بگڑتا ہے، تو دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے۔ پھر جب وہ اور بگڑ جاتا ہے تو دوسرا نقطہ لگتا ہے، یہاں تک کہ پورا دل کالے نقطوں سے بھر جاتا ہے۔ پھر بھی اگر وہ باز نہ آئے، تو تمام نقطے مل جاتے ہیں اور دل کالا ہو جاتا ہے۔ پھر یہ کالک منہ پر آجاتی ہے۔ ﴿**کلا بل ران علی قلوبهم**﴾ اب تک یہ پوری بات ان کی یاد ہے۔

جب ذرا اور بڑے ہوئے تو والد مرحوم کے وعظ اور گھر کی باتوں کو بھی خوب سمجھنے لگے۔ ہمیشہ وہابیوں کے عقائد کا رد رہتا تھا۔ کوئی بات کہی جائے، وہ فوراً یاد آجاتے تھے۔ گریز یوں ہوتا تھا جس کے صاف معنی ان پر طعن اور ان کی تکفیر کے تھے۔ ہم نے سینکڑوں مرتبہ والد مرحوم سے سنا کہ ان کا کفر، یہود ونصاریٰ کے کفر سے بھی اشد ہے۔ یہود ونصاریٰ بھی اپنے پیشواؤں کے منکر نہیں۔ یہ خبیث تو خود اپنے پیغمبر کے منکر ہیں۔

ہم ابھی بہت ہی چھوٹے تھے، اتنے کہ اردو کی مبادیات پڑھتے تھے۔ لیکن مولوی اسماعیل، سید احمد بریلوی، **تقویۃ الإیمان** وغیرہ ناموں سے خوب واقف ہوگئے تھے۔ کیونکہ ہمیشہ سامنے آتے تھے۔ سینکڑوں مرتبہ ہمارے سامنے والد مرحوم ان لوگوں کے حالات بیان کرتے اور ہم سن سن کر اچھی طرح شناسا ہو گئے تھے۔ **تقویۃ الإیمان** کو وہ تقریر وتحریر میں **تفویۃ الإیمان** کہتے تھے۔ ان کا جو نسخہ ہے، اس کی لوح پر انہوں نے چاقو سے ایک نقطہ چھیل دیا تھا۔

[آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی ص ۲۲۶-۲۲۹]

بچپن میں جو تاریخ وہابیت کی ہمارے دل پر نقش ہوگئی تھی وہ یہی تھی۔ وہابیوں کا دشمن اسلام ہونا، خاصۃً آنحضرت ﷺ سے ان کا بغض اور تحقیر، اولیاء اللہ سے دشمنی، تمام عقائد اسلامیہ سے انکار، اور اس طرح کی صدہا باتیں تھیں جو بطور یقینیات کے کہی جاتی تھیں اور ہمیں ان میں کوئی شک نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ بات کہ وہابی، رسول اللہ ﷺ کے منکر ہیں،

ایک ایسا مسلم واقعہ تھا، جو بلا کسی تمہید و استدلال کے ہمیشہ بولا جاتا تھا۔ گویا اس بارے کسی ردوکد کی گنجائش نہیں ہے۔

ہمیں اس وقت یقین تھا کہ وہابی ان لوگوں کو کہتے ہیں، جو اول تو نبی ﷺ کی فضیلت کے قائل ہی نہیں۔ اگر قائل ہیں بھی تو صرف اتنے جیسے چھوٹے بھائی کے لیے بڑا بھائی۔ معجزات کے بھی منکر ہیں، ختم نبوت کے بھی قائل نہیں، آنحضرت ﷺ سے تو ان کو خاص بغض ہے۔ جہاں کوئی بات ان کی فضیلت و منقبت کی آئی اور انہیں مرچیں لگیں۔ مجلس میلاد کے اس لیے منکر ہیں کہ اس میں آنحضرت ﷺ کی تعظیم ہے۔ درود شریف پڑھنے کو بھی برا جانتے ہیں۔ یا رسول اللہ ﷺ کی فضیلت، اولیاء اللہ کی منقبت، بزرگان دین کی بزرگی کی بات کہی جائے، فوراً اسے شرک و بدعت کہہ دیتے ہیں، اس لیے کہ انہیں ان سب سے بغض و کینہ ہے۔ اور ان کی توہین و تذلیل ان کو خوش آتی ہے۔ بحیثیت مجموعی وہابیوں کے بدترین خلائق ہونے، کافر ہونے، کافروں میں بدترین قسم کے کافر ہونے میں کسی ردوکد کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ وہابیت کے متعلق یہ فضا تھی، جس میں میں نے پرورش پائی۔ [آزاد کی کہانی ص ۲۳۳]

(جناب آزاد فرماتے ہیں) یہ پہلا موقعہ ہے کہ ذہن کے سامنے وہابیوں کے بارے میں سوالات آئے، اور وہ جو ایک یقین کی حالت تھی، اس میں حرکت ہوئی۔ اب خود بخود آہستہ آہستہ جیسے میں ایک نئے راستے میں بڑھ رہا ہوں، مگر رکاوٹ کے ساتھ، قدم رک رک کر اور ڈرتے ڈرتے اٹھتے ہیں، میں سوچنے لگا کہ اگر وہابیوں کے ایسے ہی خیالات ہیں، تو وہ کیوں اتنے برے ہیں؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض باتیں ان کی ٹھیک بھی ہیں۔

اس حالت کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ تفتیش و جستجو کا شوق پیدا ہوا۔ اور اس طرح میں پہلی مرتبہ اپنی ذاتی رائے و فکر سے ایک معاملہ پر غور کرنے لگا۔ میں نے **تقویۃ الایمان** دیکھی...... پھر مجھے ایک اور رسالہ بمبئی کا چھپا ہوا **نصیحۃ المسلمین** مولوی خرم علیؒ کا ملا۔ اس کے آخر میں ایک نظم بھی تھی۔ اسی وقت کی پڑھی ہوئی، مجھے اب تک یاد ہے۔

خدا فرما چکا قرآں کے اندر مرے محتاج ہیں پیر و پیمبر
جو خود محتاج ہووے دوسروں کا بھلا اس سے مدد کا مانگنا کیا

مجھے اس سے بڑی دلچسپی ہوئی۔ اب وہ وقت آتا جاتا تھا کہ آنکھیں کھلتی جاتی تھیں۔ مطالعے کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جاتا تھا۔ گھر سے باہر بھی درس کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ رفتہ رفتہ میں بہت سی کتابیں دیکھ گیا، اور اب وہابیوں کے رد کے رسالے بھی، جو مکان پر موجود تھے، میں دیکھنے لگا۔ اور گو اچانک رائے میں انقلاب ہو جانا دشوار تھا، خصوصاً ایسی

انتہائی سلبی حالت میں، جو پہلے تھی۔ تاہم سلب سے ایجاب تک آنے کو اگر مختلف ٹکڑے کر کے اس کی ڈگریاں قرار دی جائیں، تو میں اب اس ڈگری پر تھا کہ نفرت و وحشت بالکل جا چکی تھی۔ وہ بھیانک اور ہولناک تصور جو عجیب الخلوق وہابیوں کا دل پر نقش ہوا تھا، اب مٹ چکا تھا، اور ایسی حالت پیدا ہوگئی تھی، جس کو ہمدردی اور میلان سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ [آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی ص۲۳۳-۲۳۴]

سال بھر کے بعد میں ایک مستقل ذاتی فکر ورائے کے قریب پہنچ چکا تھا اور علانیہ بحث وگفتگو میں اپنے خیالات ظاہر کرنے لگا۔ والد مرحوم کے علاوہ جن اساتذہ سے پڑھنے کا اتفاق ہوا، وہ بھی تقریباً اس بارے میں بہت ہی سخت تعصب رکھتے تھے، تاہم ایسا ہوا کہ درس کی صحبتوں میں ہمیشہ میرے اعتراضات وسوالات کا میلان اسی طرف رہنے لگا۔ خصوصاً درس فقہ وحدیث میں۔

مباحث خلافیہ میں ان لوگوں کے بحث واستدلال کا ایک خاص اسلوب اور ایک خاص مقدار ہے۔ اور وہ مدتوں سے درس وتدریس میں برابر چلی آتی ہے۔ نہ گھٹتی ہے نہ بڑھتی ہے۔ احادیث ما بہ النزاع اور مباحث فقہیہ ومباحث اصول، ان سب میں چند بندھی ہوئی بحثیں ہیں اور وہی ہمیشہ دہرائی جاتی ہیں۔ لیکن اب جبکہ فکر ونظر کی راہ مجھ پر کھل چکی تھی اور ذہن تقلیدی بندشوں سے روز بروز آزاد ہوتا جاتا تھا، یہ بحثیں میری کیا تشفی کرسکتی تھیں!

مسئلہ تقلید ائمہ، تعین والتزام، انحصار در ائمہ اربعہ، ادعائے اجماع مرکب، سد باب ومنع نظر واحتجاج علی الاطلاق، مسئلہ اجماع، شرائط اجماع، توسیع مصالح مرسلہ، شرائط روائت ودرائت، ترجیح قیاس، انکار ترجیح صحاح وصحیحین، مسئلہ قراءت خلف الامام، تامین، رفع الیدین، قضاء قاضی ظاہراً وباطناً، نقض طہارت از قہقہہ وغیرہ مباحث ومسائل پر اساتذہ سے بڑی گرم بحثیں رہنے لگیں۔

مولوی نذیر الحسن مرحوم بڑے گویا اور قواعد منطقیہ سے خوب تقریر میں کام لینے والے تھے۔ درس کی تقریریں خوب منجھی ہوتی تھیں، لیکن انہیں بارہا تقریباً ہار ماننا پڑی۔ **نورالانوار** میں مذاہب اربعہ اور اجماع مرکب کی بحث ایک ہفتے تک جاری رہی۔ تین اساتذہ اکٹھے ہوگئے تھے اور بڑی بڑی تیاریاں کر کے صبح کو آتے تھے، لیکن میری تشفی نہیں کرسکتے تھے۔

مولوی محمد ابراہیم جو بڑے مستعد مدرس تھے اور ان کو استحضار بلا کا تھا، صفحوں کے صفحے کتابوں کے برزبان یاد تھے۔ انہوں نے مجھے یاد ہے، مسئلہ اجماع اور ایک مرتبہ قراءت فاتحہ میں بڑا زور لگایا اور خاص طور پر مطالعہ کیا۔ ہمارے ہی یہاں سے **فتح القدیر** اور دیگر شروح ہدایہ.....نکلوا کر دیکھتے رہے۔ مولوی عبدالحی مرحوم فرنگی محلی کا